Sociology & Cultural Research Review (SCRR)
Available Online: https://scrrjournal.com
Print ISSN: 3007-3103 Online ISSN: 3007-3111
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

Apparent Contradictions in Narrative Verses of the Qur'an: An Analytical Study

آیاتِ قصص میں بظاہر تعارض: مطالعہ و تجزیہ

Hafiz Muhammad Asghar Shakir
M. Phil Islamic Studies, Government College University Faisalabad, Pakistan,
mirzaasghar840@gmail.com
Dr. Mahmood Ahmad (Corresponding Author)
Assistant Professor, Department of Islamic Studies, Government College University Faisalabad, Pakistan,
mahmood.ahmad@gcuf.edu.pk

Abstract
This research paper addresses the perceived contradictions found in the narrative verses (Āyāt al-Qaṣaṣ) of the Qur'an, which have been a focal point for critics seeking to challenge the Qur'an's historical and textual consistency. The study examines stories of previous prophets and nations, analyzing how seemingly divergent accounts—such as variations in the story of Prophet Moses (Musa), Pharaoh, and others—can be harmonized through deeper contextual, linguistic, and exegetical analysis. By employing classical tafsir literature and principles of Qur'anic coherence (munāsabah), the paper argues that these contradictions are only apparent and result from fragmented or selective readings. The findings reinforce the integrity and unity of Qur'anic narrative discourse and demonstrate that variations serve rhetorical, thematic, or pedagogical purposes.

Keywords: *Narrative Verses, Apparent Contradictions, Āyāt al-Qaṣaṣ, Qur'anic Coherence, Tafsir, Prophetic Stories, Exegesis, Contextual Interpretation*

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آخری کتاب کی صداقت وحقانیت پر جو دلائل دیے، ان میں سے ایک اہم دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کے تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلاَفًا کَثِیْرًا"[1]

"تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے"

جو بھی قرآن مجید میں تفکر و تدبر کرے گا تو قرآن مجید کے اس دعویٰ کی صداقت اس پر واضح سے واضح تر ہوتی چلی گئی۔ قرآن مجید کا تناقض اور اختلاف سے پاک ہونا ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار کوئی بھی انصاف پسند آدمی نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں زبان و ادب کے مختلف اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی قرآنی اسالیب کی ان نزاکتوں سے واقف نہ ہو یا الفاظ کی حقیقت تک رسائی نہ رکھتا ہو یا نسخ کی حقیقت سے ناآشنا ہو تو ممکن ہے وہ بعض مقامات میں تضاد کی کیفیت محسوس کرے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہو گا۔

---

[1] النساء:۸۲

حضرت مریم علیہا السلام سے کتنے فرشتوں نے کلام کیا؟:

حضرت مریم علیہا السلام سے فرشتوں کے کلام کے حوالے سے ان کی تعداد پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔اس سوال کا جواب قرآن مجید سے ہی ملتا ہے۔ایک مقام پر ارشاد ہے:

"اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ"[2]

"جب فرشتوں نے کہا اے مریم !بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا"[3]

"ہم نے ان کے پاس اپنی روح (جبریل امین) کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک مکمل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت صرف جبریل امین نے دی تھی اور مابعد آیات بھی اسی کی مؤید ہیں کہ بشارت ایک فرشتے نے ہی دی اور جبریل امین نے کہا:

"اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا"[4]

"میں تمہارے ربّ کا (بھیجا ہوا) قاصد ہوں اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ میں تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں"

یہاں اَهَبَ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔اس سے واضح ہے کہ بشارت ایک فرشتے نے دی اور یہاں جبریل کی طرف بیٹا دینے کی نسبت مجازی ہے کیونکہ وہ اس کا سبب بن رہے تھے ورنہ بیٹے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ان دونوں آیات میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے کہ سورۃ آل عمران میں کہاں فرشتوں نے بشارت دی اور سورۃ مریم میں فرمایا کہ ایک فرشتے نے بشارت دی۔حقیقت میں یہاں کوئی تضاد نہیں یہ صرف زبان کا ایک اسلوب ہے۔سورہ مریم سے واضح ہے کہ بشارت صرف جبریل امین علیہم السلام نے دی تھی چونکہ وہ فرشتوں کے سردار ہیں تو ان کی بات گویا سب کی بات تھی جیسے امام کی قرآت سب مقتدیوں کی قرآت ہوتی ہے۔یہاں الملائکہ کے متعلق علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

"والمراد من الملائكة رئيسهم جبريل"[5]

"کہ یہاں الملائکہ سے مراد ان کے سردار جبریل ہیں"

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"المراد بالملائكة ههنا جبريل وحده"[6]

"یہ ملائکہ سے مراد صرف جبریل ہیں"

ممکن ہے جبریل امین اور فرشتوں کی معیت میں آئے ہوں تو سب کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کا صیغہ بول دیا اور رئیس و متکلم کا اعتبار کرتے ہوئے واحد کا۔یہ ایسے ہی ہے

---

[2] آل عمران:۴۵

[3] مریم:۱۷

[4] مریم:۱۹

[5] ابوالفضل، محمود آلوسی، روح المعانی، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ج۳، ص ۱۵۴

[6] رازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، مکتب الاعلام الاسلامیۃ، ج۸، ص ۴۴

جیسے ایک انسان کسی عالم سے کوئی مسئلہ پوچھے اور پھر کہے کہ اس مسئلہ میں علماء یہ کہتے ہیں۔ بہر صورت یہ زبان کا اسلوب ہے تضاد نہیں۔

قوم ثمود کیسے تباہ ہوئی؟:

قوم ثمود کی تباہی کے سبب کو بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر فرمایا:

"فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ"[7]

"تو انہیں ایک زلزلے نے پکڑ لیا"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"وَاَخَذَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الصَّیۡحَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ"[8]

"تو جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، انہیں ایک چنگھاڑ نے پکڑ لیا تو وہ اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے پڑے رہ گئے"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُہۡلِکُوۡا بِالطَّاغِیَۃِ"[9]

"رہے ثمود تو وہ حد سے بڑھی ہوئی چیز سے ہلاک کر دیے گئے"

"فَاَخَذَتۡہُمۡ صٰعِقَۃُ الۡعَذَابِ الۡہُوۡنِ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ"[10]

"تو انہیں ان کے کرتوتوں کے سبب سراپا ذلت کڑک نے آن پکڑا"

ان آیات میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں ہلاکت کا سبب زلزلہ، دوسری میں چنگھاڑ، تیسری میں الطاغیۃ اور چوتھی میں صَاعِقۃ کو قرار دیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہاں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ ان کی ہلاکت اس طرح ہوئی کہ جبریل امینؑ نے ایک چیخ ماری جس سے ان کے دل سینوں میں پھٹ گئے اور مر گئے۔ جب سخت آواز آئے تو اس سے زمین میں تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے یعنی الصیحۃ، الرجفۃ کا سبب تھی۔ الرجفۃ ان کی ہلاکت کا سبب قریب اور الصَّیۡحۃ سبب بعید تھا تو ان کی ہلاکت کا ذکر کبھی سبب قریب سے کیا گیا اور کبھی سبب بعید سے اور ایک قول یہ بھی کہ ان پر اوپر سے چیخ کا عذاب آیا اور نیچے سے زلزلے کا:

"الزلزلۃ الشدیدۃ من الارض و الصیحۃ من السماء"[11]

"زمین سے شدید زلزلہ آیا اور آسمان سے چنگھاڑ کی آواز آئی"

"لأن عذابھم کان بھما معا"[12]

---

[7] الاعراف:۷۸

[8] ھود:۶۷

[9] الحاقۃ:۵

[10] حٰم السجدۃ:۱۷

[11] السیوطی، جلال الدین، تفسیر جلالین، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ج۱، ص۲۷۱

[12] الصاوی، احمد بن محمد، تفسیر صاوی، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ج۱، ص۲۷۱

"کیونکہ ان پر بیک وقت دونوں طرح سے عذاب آیا"

اس لیے الصیحۃ اور الرجفۃ میں کوئی تضاد نہیں۔ عذاب کا تیسرا سبب الطاغیۃ بیان کیا گیا۔ الطاغیۃ حد سے بڑی ہوئی چیز کو کہا جاتا ہے چونکہ یہ عذاب بہت سخت اور حد سے بڑھا ہوا تھا اس لیے اسے الطاغیۃ سے تعبیر کیا گیا اور ان کی تباہی کا سبب الصاعقہ بھی قرار دیا گیا۔ یہ بھی دراصل اسے عذاب کی تعبیر ہے: فان الصاعقہ ھی الصوت الشدید من الجو[13] کیونکہ الصاعقۃ دراصل فضا سے آنے والی سخت آواز کو کہا جاتا ہے۔ تو دراصل ان چیزوں میں تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ جیسے اگر کسی کے بیٹے کا نام ڈاکٹر قاری محمد اسلم ہو تو وہ کبھی اسے بیٹا کہہ کر پکارے، کبھی ڈاکٹر صاحب، کبھی قاری صاحب اور کبھی اسلم کہہ کر پکارے تو یہ تضاد نہیں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔

جہاد اور امت:

قرآن مجید میں ایک مقام پر حضور اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ "[14]

"اور یقیناً آپ بلند اخلاق پر فائز ہیں"

اور ایک مقام پر ایک واقعہ کے تناظر میں فرمایا گیا:

"عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۔اَنْ جَآءَ هُ الْاَعْمٰی "[15]

"حضور ﷺ چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا، اس لیے کہ آپ کے پاس ایک نابینا آیا"

ایک اور مقام پر جہاد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ "[16]

"اور جب ان لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہو جو کفر پر ڈٹ گئے تو ان کی گردنیں اڑا دو۔ یہاں تک کہ جب ان کی خوب خونریزی کر چکو تو انہیں مضبوطی سے باندھو"

ان آیات طیبات کے متعلق یہ کہا گیا کہ ان میں تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ کسی سے منہ پھیرنا اور خون ریزی کرنا اخلاق کے خلاف ہے۔ جبکہ یہ تینوں آیات اپنی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں سمجھنا ہو گا کہ اخلاق کی حقیقت کیا ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہے تاکہ اخلاق کے متعدد مظاہر کی روشنی میں ان آیات میں تطبیق سمجھی جاسکے۔ اخلاق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"الخلق ملکۃ نفسانیۃ یسھل علی المتصف بھا الاتیان بالافعال الجمیلۃ"[17]

---

[13] الاصفہانی، امام راغب، مفردات الفاظ القرآن، مادہ صعق، دار الکاتب العربی، ص ۲۸۶

[14] القلم: ۴

[15] عبس: ۱، ۲

[16] محمد: ۴

[17] الرازی، التفسیر الکبیر، ج ۳۰، ص ۸۱

"خلق نفس کی اس صلاحیت کو کہاجاتا ہے کہ جس سے متصف ہونے والے شخص پر اچھے کام بجالانا آسان ہوجاتا ہے"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خلق اس صلاحیت کانام ہے جس کی وجہ سے انسان بغیر کسی تکلف اور تردد کے اچھے کام سرانجام دیتاہے جیسے کان بغیر کسی تردد کے سنتے اور آنکھ بغیر کسی تردد کے دیکھتی ہے، اسی طرح وہ بغیر کسی تردد کے ہر اچھاکام سرانجام دیتاہے۔

یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ اچھے کام کی نوعیت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی اور تمام بندوں کے معاملہ میں اچھاکام ہمیشہ ایک نوعیت کانہیں ہوتا کچھ انسان دلیل کی بات سمجھتے ہیں، کچھ پیار کی اور کچھ سختی کی۔ ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق معاملہ کرنا ہی اچھاکام کہلائے گا۔ جو بندہ سختی کی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان سمجھتا ہی نہیں، اس کے ساتھ نرم رویہ ہی رکھ کر اسے مزید بگاڑ دینا اچھاکام کہلائے گا اور نہ ہی اخلاق عالیہ بلکہ یہ اس کے ساتھ زیادتی اور ظلم ہوگا کہ اس پر سختی نہ کر کے اس کے مزید بگڑنے کے اسباب فراہم کیے جائیں۔ انسانوں کو معاف کرنا بہت اچھی چیز ہے لیکن اگر ایک انسان کسی بے گناہ کو قتل کر کے اس کے بچوں کو یتیم کرے اور اس کی بیوی کا سہاگ اجاڑ دے تو اخلاق کا تقاضا اسے معاف کرنا نہیں ہوگا بلکہ اخلاق کا تقاضا اسے سزا دینا ہوگا تاکہ آئندہ کوئی کسی کو قتل کر کے اس کے بچوں کو یتیم نہ کرے کیونکہ قانون الٰہی میں قصاص میں زندگی ہے۔ مجرم کو سزا دیتے وقت جس کے ہاتھ کانپ جائیں وہ رحم دل نہیں بزدل ہوتا ہے۔ مجرم کو سزا دینا اخلاق کے منافی نہیں بلکہ عین اخلاق کا تقاضا ہوگا اور اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا نرم رویہ رکھنا کہ وہ بگڑتے چلے جائیں، اخلاق نہیں کہلائے گا بلکہ اخلاق کا تقاضا یہ ہوگا کہ نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کی جائے۔

اس اصولی بک 8 ات کو سمجھ لینے کے بعد بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ ان تینوں آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ تو حضور اکرم ﷺ کا ناراض ہونا اور روئے زیبا پھیرنا اخلاق کے منافی ہے اور نہ ہی کافروں کی خون ریزی کرنا۔ سورہ عبس والی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رسول کریم ﷺ قریش کو دعوت اسلام دینے میں مگن تھے کہ ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم حاضر خدمت ہوئے اور حضور ﷺ کو بلند آواز سے پکارنے لگے، جس کی وجہ سے کارِ دعوت میں خلل واقع ہوا۔ اگرچہ ان کا یہ عمل دانستہ نہیں تھا لیکن بہتر ہوتا کہ وہ پہلے رسول اللہ ﷺ کی مصروفیت کے بابت کسی دوسرے صحابی سے پوچھ لیتے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کا یہ رویہ ان کی تأدیب کے لیے تھا تاکہ لوگوں پر کارِ دعوت کی حساسیت نمایاں ہوجائے اور یہ بات تأدیب اخلاق کے منافی نہیں ہوتی۔ ماں اگر بیٹے کو ادب سکھاتے تھپڑ بھی مار دے تو کوئی احمق ہی اخلاق کے منافی قرار دے گا کیونکہ تادیب عین اخلاق ہے، اخلاق کے منافی نہیں۔ اسی طرح مشرکین کی خونریزی بھی اخلاق کے منافی نہیں بلکہ عین اخلاق ہے جیسے ایک ماہر ڈاکٹر جسم کا وہ حصّہ کاٹ دیتا ہے جس سے جسم کے باقی حصے کے خراب ہونے کا خدشہ ہو۔ ایسا کرنا رحم دلی کے منافی ہوتا ہے اور نہ ہی اخلاق عالیہ کے بلکہ یہ ایک اعلیٰ اور بلند مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی تمام تر محبتوں اور شفقتوں کے باوجود جو سرکش لوگ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، انہوں نے اللہ کی زمین کو فساد سے بھر رکھا تھا، انہیں سخت سے سخت سزا دینا تاکہ وہ حق پرستی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں پوری انسانیت پر رحم اور عین اخلاق ہے اور اسلامی جہاد سے صرف مسلمانوں کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ مخلوقِ خدا کو بادشاہوں کے جبر سے نجات ملی۔ اگر اسلام ان سرکشوں کو سخت سے سخت سزا نہ دیتا تو دنیا اس جبر سے نجات کیسے پاتی؟ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں بلکہ تادیب اور سرکشوں کو سزا دے کر انسانیت کو ان کے شرّ سے بچانا سب اخلاق عالیہ کے ہی مظاہر ہیں۔

دین میں جبر ہے یا نہیں؟:

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ"[18]

[18] البقرہ:۲۵۶

"دین میں کوئی جبر نہیں"

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

"قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلاَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلاَ یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، وَلاَ یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ"[19]

"وہ اہل کتاب جو نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے اور نہ دین حق کو اپنا دین تسلیم کرتے ہیں، آپ ان سے جنگ کریں"

ان دونوں آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ دین میں جبر نہیں ہے اور دوسری آیت میں فرمایا کہ دین قبول نہ کرنے والوں سے لڑو۔

جب جبر نہیں تو پھر لڑائی کیوں؟ کہنے کو تو کوئی کچھ بھی کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں۔ دین میں جبر نہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ دین قبول کرنے میں کس پر جبر نہیں کیا جائے گا اور جہاد کا مقصد انہیں جبراً مسلمان کرنا نہیں بلکہ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ وہ دین الٰہی کی برتری کو قبول کریں اور ذمی بن کر جس عقیدے پر چاہیں رہیں اور سورۃ التوبہ کی اسی آیہ کریمہ کے آخری الفاظ اسی مفہوم کو خوب واضح کر رہے ہیں کہ فرمایا:

"حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّہُمْ صٰغِرُوْنَ"[20]

"کہ ان سے اس وقت لڑو جب تک وہ اپنی پستی کا احساس کرتے ہوئے جزیہ نہ دیں"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد کا مقصد جبراً دین قبول کروانا نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے غلبہ اور تسلط کر منوانا ہے اور لا اکراہ فی الدین والی آیت تو نازل ہی اس وقت ہوئی تھی کہ بنو اوس کے کچھ بچے قبیلہ بنو نضیر کے ہاں رضاعت پر پلے تھے اور بنو نضیر یہودی تھے۔ ان بچوں نے کہا ہم تو یہودیوں کے ساتھ جائیں گے اور انہیں کا دین قبول کریں گے، تو بنو اوس نے چاہا کہ انہیں جبراً مسلمان کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرما کے بنو اوس کو ان بچوں کو جبراً مسلمان کرنے سے روک دیا۔[21]

واضح رہے کہ دین قبول کرنے میں کسی پر جبر نہیں ہے لیکن جب کوئی اپنی مرضی سے دین قبول کرلے تو پھر احکامات پر عمل کرنے میں ان پر سختی کی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہ آیت بھی لا اکراہ فی الدین کے منافی نہیں ہے:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَط خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"[22]

"اور یاد کرو جب ہم نے تم سے (تورات پر عمل کرنے کا) عہد لیا اور پھر (نافرمانی کرنے پر)، کوہ طور تمہارے اوپر بلند کر دیا کہ جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی اسے مضبوطی سے تھامو"

اور اس میں جو کچھ ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یہاں بھی دین میں ان پر کوئی جبر نہیں تھا بلکہ انہوں نے عہد اپنی مرضی سے باندھا۔ جب اسے توڑا تو ان پر سختی کی گئی۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

---

[19] التوبہ:۲۹

[20] التوبہ:۲۹

[21] الواحدی، ابو الحسن علی بن احمد، کراچی، دار الاشاعت، ص ۷۷

[22] البقرہ:۶۳

"و المعنى ان اخذ الميثاق كان متقدما فلما نقضوه بالامتناع عن قبول الكتاب رفع عليهم الجبل"[23]

"کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے پہلے قبول کتاب کا عہد لیا گیا تو جب انہوں نے عہد توڑا تو پہاڑ ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین میں جبر نہ ہونے اور حکم جہاد میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ جہاد کا مقصد جبراً دین قبول کروانا نہیں بلکہ کافروں کے فساد کو ختم کرنا ہے۔ قاضی مظہریؒ فرماتے ہیں:

"فان الامر بالقتال و الجهاد ليس لاجل الاكراه على الدين بل لدفع الفساد من الارض فان الكفار يفسدون فى الارض ويصدون عبادالله عن الهدى والعبادة"[24]

"جہاد اور قتال کا حکم دین پر جبر کرنے کے لیے نہیں بلکہ زمین سے فساد ختم کرنے کے لیے تھا کیونکہ کافر زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور لوگوں کو ہدایت قبول کرنے اور عبادت الٰہی سے روکتے تھے "

اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہے۔

گمراہ کون کرتا ہے؟:

اس تناظر میں مندرجہ ذیل آیات میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا۔ایک مقام پر شیطان کے متعلق فرمایا گیا:

"اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ"[25]

"بے شک وہ واضح طور پر گمراہ کرنے والا دشمن ہے"

دوسرے مقام پر فرمایا کہ قیامت کے دن شیطان اللہ تعالیٰ سے ایک بھٹکے ہوئے انسان کے متعلق کہے گا۔

"رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ"[26]

"اے ہمارے پروردگار! اسے میں نے گمراہ نہیں کیا بلکہ یہ خود پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ"[27]

"اور جسے اللہ ہدایت دے وہی سیدھی راہ چلنے والا ہے اور جنہیں اللہ گمراہ کر دے تو اللہ کے سوا تمہیں ان کا کوئی مددگار نہیں مل سکتا"

ایک اور مقام پر فرمایا:

---

[23] الرازی، التفسیر الکبیر، ج۳، ص۱۰۷

[24] تفسیر مظہری، ج۱، ص ۳۵۲

[25] القصص: ۱۵

[26] ق: ۲۷

[27] بنی اسرائیل: ۹۷

"وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِيْلًا"[28]

"اور جسے اللہ گمراہ کر دے تم اس کے لیے کوئی راہِ راست نہیں پاؤ گے"

ان آیات طیبات کے متعلق کہا گیا کہ ان میں تضاد ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا شیطان گمراہ کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا انسان خود گمراہ ہوتا ہے اور پھر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ یہاں حقیقت اور سبب کی نسبت کو فراموش کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہر کام کا فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن نظام الٰہی میں ہر کام ایک سبب کے تحت ہوتا ہے، اس لیے گمراہی کی نسبت کبھی حقیقت کی طرف کی جاتی ہے اور کبھی سبب کی طرف جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ"[29]

"کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹا دیتا ہے"

اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ بیٹے اور بیٹیاں اللہ ہی عطا کرتا ہے۔ لیکن جب جبریل امین حضرت مریم کے گریبان میں پھونک مار کے انہیں حضرت عیسیٰ علیہا السلام کی بشارت دینے آئے تو چونکہ وہ بیٹے کی پیدائش کا سبب بن رہے تھے۔ اس لیے بیٹا دینے کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لیے بھیجا ہے۔

"لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا"[30]

"تاکہ میں تجھے پاکیزہ بیٹا دوں"

تو ان دونوں آیات میں کوئی تضاد نہیں یھب میں نسبت حقیقی کا ذکر ہے اور لاھب میں سبب کی طرف نسبت کرتے ہوئے نسبت مجازی کا بیان ہے۔ اسی طرح مذکورہ چاروں آیات میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کام کا فاعل حقیقی ہے۔ قانون الٰہی کے مطابق جو بندہ گمراہی کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ چونکہ گمراہی کا سبب شیطان بنتا ہے اور وہ انسان کو وسوسہ اندازی اور دیگر کئی طریقوں سے گمراہی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس لیے گمراہی کی نسبت کبھی شیطان کی طرف کر دی جاتی ہے اور چونکہ انسان شیطانی وسوسوں کو قبول کر کے گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے اس لیے گمراہی کی نسبت کبھی انسان کی طرف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت فاعل حقیقی ہونے کی جہت سے ہے اور شیطان یا انسان کی طرف اس کا سبب ہونے کے ناطے اس لیے ان ایات میں تضاد کا دعویٰ ایک بے حقیقت بات ہے۔

ابلیس جنّ تھا یا فرشتہ؟:

مندرجہ ذیل دو آیات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن کریم کے بیان میں اس سوال کے جواب میں تضاد ہے کہ ابلیس جنّ تھا یا فرشتہ۔ پہلی آیہ کریمہ یہ ہے:

"وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ"[31]

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا"

اور دوسرے مقام پر شیطان کے متعلق فرمایا:

[28] النساء:۸۸

[29] الشوریٰ:۴۹

[30] مریم:۱۹

[31] البقرہ:۳۴

"كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ "[32]

"وہ جنّات میں سے تھاتواس نے اپنے ربّ کے حکم کی نافرمانی کی"

ان آیات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیااور دوسرے مقام پر جنّ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بے دلیل بات ہے۔ شیطان کی اصل کے بارے میں اگرچہ طویل مباحث موجودہیں لیکن بعض اصولی باتوں کی روشنی میں حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ فرشتوں کے متعلق یہ واضح فرمایا گیا:

"لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَہُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ"[33]

"وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جائے وہی بجالاتے ہیں"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور پھر کان من الجنّ تو نص ہے کہ وہ جنّوں میں سے تھا۔ یہاں تک سطورِ بالا میں مذکور سورۃ البقرہ کی آیت ۳۴ کا تعلق ہے تو اس میں شیطان کا فرشتوں سے استثناء کیا گیاہے۔ وہاں یہ تو نہیں کہا گیا کہ وہ فرشتوں میں سے تھا، صرف یہ فرمایا گیا کہ فرشتوں نے سجدہ کیا، ابلیس نے نہیں کیا۔ استثناء تو متصل بھی ہو سکتاہے اور منقطع بھی۔ تو یہاں واضح نصوص کا تقاضا ہے کہ اس سے مراد مستثنیٰ منقطع لیا جائے کہ یہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن چونکہ فرشتوں کے ساتھ عبادت کرتا تھا تو جو حکم اعلیٰ کو دیا جائے، ادنیٰ اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہوتاہے۔ جس کی تعظیم بادشاہ کرے گا، رعایا پر اس کی تعظیم بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگی۔ چنانچہ جب فرشتوں کو حکم دیا گیا تو شیطان بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہو گیا۔ اس آیت سے اس کی سرکشی ثابت ہوتی ہے۔ اس کا فرشتوں میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہاں مستثنیٰ متصل نہیں منقطع ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ کے حکم میں جنّات بھی شامل ہوں۔

"لکنہ استغنی عن ذکرھم بذکر الملائکۃ لان الاکابر لما امروا بالسجود فالاصاغر اولیٰ"[34]

"لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنون کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی کیونکہ جب اکابر کو سجدے کا حکم دیا گیا تو اصاغر اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہو گئے"

اس بحث میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"و الراجح لدی القول الاوّل لصریح آیۃ کان من الجن والأنّ ابلیس قدعصی امر ربہ و الملائکۃ لا یعصون اللہ ما امرھم"[35]

"اور میرے نزدیک راجح قول پہلا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا کیونکہ اس پر صریح آیت دلیل ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور ابلیس نے تو اپنے ربّ کی نافرمانی کی اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب لوگوں سے کلام کرے گا یا نہیں؟:

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت کے بدلہ میں بیچ دیا ان کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں پھر فرمایا:

---

[32] الکہف:۵۰

[33] التحریم:۶

[34] دریا آبادی، مولانا عبدالماجد، تفسیر مظہری، ج۱، ص۶۶

[35] زحیلی، التفسیر المنیر، ج۱، ص۱۴۶

"وَلاَ يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلاَ يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلاَ يُزَكِّيْهِمْ"[36]

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"فَوَرَبِّکَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"[37]

"تو آپ کے رب کی قسم! ہم سب سے ان کے اعمال کے متعلق پوچھیں گے"

ان دونوں آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلی آیت میں منکرین سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت سب سے کلام کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی ان آیات میں تضاد ہے۔ جبکہ درحقیقت ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے یا تو اس لیے کہ یہاں جس کلام کی نفی ہے وہاں کلام محبت و الطاف مراد ہے اور یہاں کلام کا اثبات ہے، وہاں کلام غضبی مراد ہے جو منکرین کے لیے اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا اظہار ہو گا یا یہاں کلام کی نفی ہے، وہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا بلا واسطہ کلام کرنا ہے اور یہاں کلام کا اثبات ہے، وہاں فرشتوں کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا مراد ہے۔ امام بیضاوی لا یُکلِّمُہُمُ اللّٰہُ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"بما يسرهم اوبشئى اصلا و ان الملائكة يسئلونهم يوم القيامة اولاينتفعون بكلمات الله و آياته والظاهر انه كناية عن غضبه عليهم"[38]

"یعنی اللہ تعالیٰ ان سے ایسا کلام نہیں کرے گا جو انہیں خوش کرے یا اللہ تعالیٰ ان سے بالکل کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان سے سوال فرشتے کریں گے یا وہ اللہ تعالیٰ کے کلمات اور اس کی آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور ظاہر ہے یہ ان کے لیے غضب الٰہی کا کنایہ ہے"

مراد یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ یہاں نفی ایسے کلام کی ہے جو انہیں خوش کرے جبکہ ان سے سوال کرنا تو انہیں عذاب دینے کے لیے ہو گا یا اللہ تعالیٰ ان سے بالکل کلام نہیں کرے گا اور ان سے سوال فرشتے کریں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنا کوئی حکم کارندوں کے ذریعے سے اپنی رعایا تک پہنچائے اور پھر کہے کہ ہم نے اپنی رعایا کو یہ حکم دیا ہے، یہی اسلوب یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ ان سے ایسے کلام کی نفی ہے جو انہیں فائدہ دے اور سوال کرنے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ نقصان ہو گا۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہوتی ہے۔

جادوگر حضرت موسیٰ علیہا السلام پر ایمان لائے تھے یا نہیں؟:

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

"فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلاَّ ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلاَ ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ"[39]

"فرعون اور اس کے سرداروں کے فتنہ کے خوف سے موسیٰ علیہا السلام پر ان کی قوم کے چند نوجوان ہی ایمان لائے"

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہا السلام کی لاٹھی سے بننے والا اژدہا جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا تو اس وقت جادوگر سجدے میں گر گئے:

[36] آل عمران: ۷۷

[37] الحجر: ۹۲، ۹۳

[38] بیضاوی، ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر، انوار التنزیل واسرار التاویل، ج ۱، ص ۱۷۱

[39] یونس: ۱۰

"وَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ ۔ قَالُوْٓااٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"[40]

"اس واقعہ نے جادوگروں کو بے ساختہ سجدہ میں گرادیا اور وہ پکار اٹھے کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے"

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا ہے کیونکہ پہلی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پر آپ کی قوم کے ہی چند نوجوان ایمان لائے تھے کوئی اور نہیں۔ جبکہ دوسری آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پر جادوگر بھی ایمان لائے تھے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں تضاد کا دعویٰ کرنا ایک بہت بے حقیقت اور انتہائی سطحی سی بات ہے کیونکہ جادوگر بعد میں حضرت موسیٰ علیہا السلام سے مقابلہ کرنے کے بعد مسلمان ہوئے تھے جبکہ جس آیت میں چند نوجوانوں کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے وہ آپ کے دعویٰ رسالت کے بعد فوری حالات کا بیان ہے۔ فما امن الموسیٰ کی تفسیر میں علامہ الزمخشری لکھتے ہیں:

"فی اوّل امرہ"[41]

یعنی آپ کے دعویٰ رسالت کے بعد شروع شروع میں آپ پر چند نوجوان ہی ایمان لائے تھے۔ امام نسفی نے بھی یہی لکھا ہے۔[42]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی قوم میں سے صرف چند نوجوانوں کا آپ پر ایمان لانا آپ کے دعویٰ رسالت کے بعد ابتدائی دنوں کی بات ہے اور جادوگروں کا مسلمان ہونا اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بنی اسرائیل بچھڑے کی پوجا پر نادم ہوئے یا ڈٹ گئے؟:

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

"قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْہِ عٰکِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی"[43]

"وہ بولے جب تک موسیٰ علیہا السلام واپس نہ آجائیں ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے"

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

"وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْہِمْ وَرَاَوْا اَنَّہُمْ قَدْ ضَلُّوْالا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَارَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ"[44]

"اور جب وہ اپنے کیے پر نادم ہوئے اور سمجھ گئے کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں تو کہنے لگے اگر ہمارے ربّ نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہماری بخش نہ کی تو ہم یقیناً خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے"

ان آیات کی روشنی میں بھی قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلی آیت میں تو بیان کیا گیا کہ وہ بچھڑے کی عبادت پر ڈٹ گئے تھے اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ نادم ہوگئے۔

تضاد کے اس دعویٰ کا حقیقت سے کوئی تعلق بالکل نہیں ہے۔ پہلی آیت میں یہی کہا گیا تھا کہ ہم موسیٰ علیہا السلام کی آمد تک اس کی عبادت میں مگن رہیں گے اور دوسری

---

[40] الاعراف:۱۱۹۔۱۲۰

[41] زمخشری، ابوالقاسم محمود بن عمر، تفسیر الکشاف، ج۲، ص ۳۴۵

[42] تفسیر مدارک: ج۲، ص ۳۶

[43] طٰہٰ:۹۱

[44] الاعراف:۱۴۹

آیت میں ان کی جس ندامت کا ذکر ہے وہ موسیٰ علیہا السلام کے آنے کے بعد کا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں حضرت موسیٰ علیہا السلام کے واپس آنے کے احوال کا تذکرہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس اس لیے ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہا السلام اس حالت غضب میں واپس آئے تھے اور انہوں نے لوگوں کو ان کی اس غلطی پر شدید الفاظ میں ڈانٹا تھا۔اس پر تمام مفسرین متفق ہیں کہ بنی اسرائیل کو یہ ندامت حضرت موسیٰ علیہا السلام کی واپسی کے بعد ہی ہوئی تھی۔ علامہ مظہریؒ لکھتے ہیں:

"والحاصل انھم ندموا علی عبادۃ العجل حین جاء ھم و عاتبھم موسیٰ"[45]

اور خلاصہ بحث یہ ہے کہ وہ بچھڑے کی پوجا پر نادم اس وقت ہوئے جب ان کے پاس حضرت موسیٰ علیہا السلام آئے اور آپ نے انہیں جھڑکا۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"و ذالک بعد رجوع موسیٰ"[46]

"اور بنی اسرائیل کی یہ ندامت حضرت موسیٰ علیہا السلام کے واپس آنے کے بعد تھی"

اس کے بعد والی آیت حضرت موسیٰ علیہا السلام کے لوٹنے کے احوال کو بیان کرتی ہے:

"اخبر سبحانہ بحال موسیٰ علیہ السلام معھم عند رجوعہ الیھم من الغضب للہ"[47]

"(اس کے بعد) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہا السلام کی اس حالت کو بیان کیا جو ان کی طرف لوٹتے وقت اللہ کے لیے غضب کا سبب تھی"

مراد یہ ہے کہ اس سے بعد والی آیت ولما رجع موسیٰ۔سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہوں نے ندامت کا اظہار پہلے کیا اور حضرت موسیٰ علیہا السلام بعد میں لوٹے بلکہ گوسالہ پرستی کرنے والوں نے ندامت کا اظہار حضرت موسیٰ علیہا السلام کے لوٹنے کے بعد کیا تھا اور یہ آیت ان کے لوٹنے کی حالت کو بیان کرتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی بات تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیتی ہے۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہ ندامت و استغفار کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہا السلام کی واپسی کے بعد کا ہے جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے۔ آیت نمبر ۱۴۸ کے بعد متصل سلسلہ بیان کے لحاظ سے آیت نمبر ۱۵۰ کو پڑھا جائے۔ یہ آیت بطور جملہ معترضہ کے ہے اور قرآن مجید کا عام اسلوب بلاغت یہ ہے کہ واقعات کی تقسیم و تاخیر کا اعتبار کیے بغیر وہ نتائج اور عبرتوں کو درمیان کلام میں لے آتا ہے"[48]

مفسرین کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیہ کریمہ کی کوئی بھی توجیہ کی جائے، یہ بات سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ندامت حضرت موسیٰ علیہا السلام کی واپسی کے بعد تھی، اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہا السلام کی وفات ہوئی یا ان کی موت مشتبہ کر دی گئی؟:

اس تناظر میں بھی قرآن مجید کی دو آیات سے حسب منشا استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا۔ پہلی آیت ہے:

---

[45] دریا آبادی، مولانا عبدالماجد، تفسیر مظہری، ج۳، ص۸۴

[46] جلالین، ج۲، ص۲۹۰

[47] امام ابراہیم بن عمر البقاعی، نظم الدرر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ج۳، ص۱۱۴

[48] دریا آبادی، مولانا عبدالماجد، تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، ص۳۵۸

"اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ"[49]

"جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ ! بے شک میں تمہیں مکمل طور پر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں"

دوسرے مقام پر فرمایا:

"وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَہُمْ"[50]

"انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہا السلام کو قتل کیا اور نہ ہی سولی چڑھایا لیکن معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا"

یہاں پہلی آیت سے مُتَوَفِّیْکَ سے عرفی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہا السلا کی وفات ثابت کی اور پھر دعویٰ کیا کہ اس آیت سے ان کی موت ثابت ہوتی جبکہ دوسری آیت سے ان کی موت کا مشتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس سے قرآن مجید کے بیان میں تضاد ثابت ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہا السلام پر موت طاری نہیں ہوئی۔ جب یہودیوں نے انہیں پھانسی دینے کا منصوبہ بنایا تو ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہا السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے اور میری جگہ پھانسی چڑھا دیا جائے اور شہادت کی موت پائے تو آپ کے ساتھیوں میں سے ایک نے اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کیا اور یہودیوں نے اسے حضرت عیسیٰ علیہا السلام سمجھتے ہوئے پھانسی چڑھا دیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ جس شخص نے آپ کی نشاندھی کی تھی اسی پر آپ کی شبیہ ڈال دی گئی اور انہوں نے اسے ہی عیسیٰ علیہا السلام سمجھتے ہوئے پھانسی چڑھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہا السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا م بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ"[51]

"اور یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہا السلا کو قتل نہیں کیا بلکہ انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا"

اسی چیز کو ولکن شبہ لھم (النسائ:۱۵۷) سے تعبیر کیا گیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہا السلا کو نہ قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن معاملہ ان پر مشتبہ کر دیا گیا۔ اور دوسری آیت میں متوفیک کے الفاظ اس سے متصادم نہیں ہیں کیونکہ یہاں توفی سے مراد عام معنی میں موت نہیں ہے۔ موت تو ہر انسان کو آئے گی۔ اس میں بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ بتائی وہ بات جاتی ہے جس میں کوئی خبریت ہو۔ الوافی کا معنی ہے الذی بلغ التمام[52] وہ چیز جو اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس صورت میں متوفیک کا معنی ہے متم عمرک[53] میں تیری عمر پوری کرنے والا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ یہ یہودی آپ کو پھانسی نہیں دے سکیں گے اور آپ اپنی پوری عمر کو پہنچ کر انتقال کریں گے اور توفی کا دوسرا مفہوم ہے اخذ الشئ وافیا [54] کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ اس صورت میں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تمہیں پھانسی نہیں دے سکیں گے، میں تمہیں مکمل طور پر آسمانوں پر اٹھالوں گا۔ اور توفی کا اصلی معنی کسی چیز کو مکمل طور پر لے لینا ہی ہوتا ہے اور اس کا معنی موت عرفی اور مجازی ہے تو یہاں اس سے مراد نہیں زندہ آسمانوں پر اٹھانا ہی ہے

---

[49] آل عمران:۵۵

[50] النساء:۱۵۷

[51] النساء:۱۵۸

[52] الاصفہانی، امام الرغب، مفردات الفاظ القران، دار الکاتب العربی،، ص ۵٦۵

[53] رازی، فخر الدین، تفسیر الکبیر، ج۸، ص ۷۱

[54] ایضاً، ج۸، ص ۷۲

اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے۔اس صورت میں اس آیت سے مراد ہے:

"انی رافعک الی ومطهرک من الذین کفروا و متوفیک بعد ان تنزل من السماء"[55]

"میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا اور کافروں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں اور آپ کے آسمان سے اترنے کے بعد آپ پر موت طاری کرنے والا ہوں"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں آیات حضرت عیسیٰ علیہاالسلا کی حیات ہی ثابت کرتی ہیں اور ان میں تضاد کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

[55] قرطبی، تفسیر قرطبی، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ج۴، ص۱۰۰